مُشتاق احمد یُوسفی

چند تصویرِ بتاں

سیکھے ہیں مہ رُخوں کے لئے.....

رئیسُ المُتغزّلین مولانا حسرتؔ موہانی نے اپنی شاعری کے تین رنگ بتائے ہیں ـــــ فاسقانہ، عاشقانہ اور عارفانہ۔ مولانا کی طرح چکّی کی مَشقّت تو بڑی بات ہے، مرزا عبدالودُود بیگ نے تو مشقِ سُخن سے بھی ذہن کو گراں بار نہیں کیا۔ تاہم وہ بھی اپنے فن (فوٹو گرافی) کو انھیں تین مُہلک ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے یہاں یہ ترتیب بالکل اُلٹی ہے۔ رہا ہمارا معاملہ، تو ابھی ہم رُوسوؔ کی طرح اتنے بڑے آدمی نہیں ہوئے کہ اپنے اوپر علانیہ فِسق وفجور کی تُہمت لگانے کے بعد بھی اپنے اور پولیس کے درمیان ایک باعزّت فاصلہ قائم رکھ سکیں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ مرزا کی طرح ہم بھی ہلاکِ فن ہیں اور ہمارا ناتا بھی اِس فن سے اتنا ہی پُرانا ہے۔ کیونکہ جہاں تک یاد پڑتا ہے، تختی پر ''قلم گوید کی من شاہِ جہانم'' لکھ لکھ کر خود کو گُمراہ کرنے سے پہلے ہم ڈک براؤنی کیمرے کا بٹن دبانا سیکھ چکے تھے۔ لیکن جس دن سے مرزا کی ایک ننگی کُھلی تصویر (جسے وہ فِگر اسٹڈی کہتے ہیں) کو لندن کے ایک رسالے نے زیورِ طباعت سے آراستہ کیا، ہماری بے ہُنری کے نئے نئے پہلُو اُن پر مُنکَشِف ہوتے رہتے ہیں۔

مرزا جب سے بولنا سیکھے ہیں،ا پنی زبان کو ہماری ذات پر ورزِش کراتے رہتے ہیں۔اور اکثر تلمیح و استعارے سے معمولی گالی گلوج میں ادبی شان پیدا کر دیتے ہیں۔ ابھی کل کی بات ہے۔ کہنے لگے، یار! بُرا نہ ماننا۔ تمہارے فن میں کوئی کروٹ، کوئی پیچ، میرا مطلب ہے، کوئی موڑ نظر نہیں آتا۔ ہم نے کہا، پلاٹ تو اُردُو ناولوں میں ہُوا کرتا ہے۔زندگی میں کہاں؟ بولے ہاں، ٹھیک کہتے ہو۔ تمہاری عکّاسی بھی تمہاری زندگی ہی کا عکس ہے۔ یعنی اول تا آخر خواری کا ایک نہ قابل تقلید اسلوب!

ہر چند کہ یہ کمالِ نے نوازی ہمارے کچھ کام نہ آیا۔ لیکن یہی کیا کم ہے کہ مرزا جیسے فرزانے کان پکڑتے ہیں اور ہماری حقیر زندگی کو اعلیٰ تعلیمی مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ یعنی اسے سامنے رکھ کر اپنی اولاد کو عبرت دلاتے ہیں، تنبیہ وفہمائش کرتے ہیں۔اِن صفحات میں ہم اپنے اسلوبِ حیات کی توجیہ وتشریح کر کے پڑھنے والوں کے ہاتھ میں کلیدِ ناکامی نہیں دینا چاہتے۔البتّہ اتنا ضرور عرض کریں گے کہ مرزا کی طرح ہم اپنی نالائقی کو ارتقائی ادوار میں تقسیم تو نہیں کر سکتے ، لیکن جو حضرات ہمارے شوقِ منفعل کی داستان پڑھنے کی تاب رکھتے ہیں، وہ دیکھیں گے کہ ہم صدا سے حاجیوں کے پاسپورٹ فوٹو اور تاریخی کھنڈروں کی تصویریں ہی نہیں کھینچتے رہے ہیں۔

گزر چکی ہے یہ فصلِ بہار ہم پر بھی

لیکن ہم کس شمار قطار میں ہیں۔مرزا اپنے آگے بڑے بڑے فوٹو گرافروں کو ہیچ سمجھتے ہیں۔ ایک دن ہم نے پوچھا، مرزا! دنیا میں سب سے بڑا فوٹو گرافر کون ہے؟ یُوسُف کا رش یا سیسل بیٹن؟ مُسکراتے ہوئے بولے،تم نے وہ حکایت نہیں سُنی؟ کسی نادان نے مجنوں سے پوچھا،خلافت پر حق حضرت حسینؑ کا ہے یا یزیدِ لعین کا؟ بولا، اگر سچ پوچھو تو لیلیٰ کا ہے!

ادھر چند سال سے ہم نے یہ معمول بنا لیا ہے کہ ہفتہ بھر کی اعصابی شکست وریخت کے بعد اتوار کو مکمّل ''سبت''مناتے ہیں۔ اور سنیچر کی مُرادوں بھری شام سے سوموار کی منحوس صبح تک ہر وہ فعل اپنے اوپر حرام کر لیتے ہیں، جس میں کام کا ادنیٰ شائبہ یا کمائی کا ذرا بھی اندیشہ ہو۔چھ دن دنیا کے،ایک دن اپنا ۔ (مرزا تو اتوار کے دن اتنا آزاد اور کُھلا کُھلا محسوس کرتے ہیں کہ فجر کی نماز کے بعد دُعا نہیں مانگتے۔ اور پیر کے تصوُّر سے ان کا جی اتنا اُلجھتا ہے کہ ایک دن کہنے لگے، اتوار اگر پیر کے دن ہوا کرتا تو کیا ہی اچھا ہوتا!) یہ بات نہیں کہ ہم محنت سے جی چُراتے ہیں۔جس شغل (فوٹو گرافی) میں اتوار گزرتا ہے،اس میں تو محنت تو اتنی ہی پڑتی ہے جتنی دفتری کام میں۔ لیکن فوٹو گرافی میں دماغ بھی استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اور''ماڈل'' اگر نچلے نہ بیٹھنے والے بچّے ہوں تو نہ صرف زیادہ بلکہ بار بار استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اس سے بچنے کے لئے مرزا نے اب ہمیں چند اُستادانہ گُر سِکھا دیئے ہیں۔ مثلاً ایک تو یہی کہ پرندوں اور بچّوں کی تصویر کھینچتے وقت صرف آنکھ پر

فوکس کرنا چاہیئے کہ ان کی ساری شخصیت کھنچ کر آنکھ کی چمک میں آ جاتی ہے۔ اور جس دن ان کی آنکھ میں یہ چمک نہ رہی، دنیا اندھیر ہو جائیگی۔دوسرے یہ کہ جس بچّے پر تمہیں پیار نہ آئے اس کی تصویر ہرگز نہ کھینچو ۔ فرانس میں ایک نفاست پسند مُصوّر گُزرا ہے جو نجیبُ الطّرفین گھوڑوں کی تصویریں پینٹ کرنے میں یدِ طُولیٰ رکھتا تھا۔ نشاطِ فن اسے اس درجہ عزیز تھا کہ جو گھوڑا دوغلا یا بیس ہزار فرینک سے کم قیمت کا ہو، اس کی تصویر ہرگز نہیں بناتا تھا، خواہ اس کا مالک بیس ہزار مخنتا نہ ہی کیوں نہ پیش کرے۔

مہینہ یاد نہیں رہا۔غالباً دسمبر تھا۔دن البتّہ یاد ہے، اس لئے کہ اتوار تھا۔ اور مذکورہ بالا زرّیں اُصولوں سے لیس، ہم اپنے اوپر ہفتہ وار خُود فراموشی طاری کیے ہوئے تھے۔گھر میں ہمارے عزیز ہم سایے کی بچّی ناجیہ، اپنی سیفو (سیامی بلّی) کی قدِ آدم تصویر کھنچوانے آئی ہوئی تھی۔ قدِ آدم سے مُراد شیر کے برابر تھی۔ کہنے لگی، ''انکل! جلدی سے ہماری بلّی کا فوٹو کھینچ دیجیے۔ ہم اپنی گُڑیا کو اکیلا چھوڑ آئے ہیں۔ کل صُبح سے بچاری کے پیٹ میں درد ہے۔ جبھی تو کل ہم اسکول نہیں گئے۔'' ہم نے جھٹ پٹ کیمرے میں تیز رفتار فلم ڈالی۔ تینوں ''فلڈ لیمپ'' ٹھکانے سے اپنی اپنی جگہ رکھّے۔ پھر بلّی کو دبوچ دبوچ کے میز پر بٹھایا۔ اور اس کے مُنھ پر مُسکراہٹ لانے کے لئے ناجیہ پلاسٹک کا چوہا ہاتھ میں پکڑے سامنے کھڑی ہوگئی۔ ہم بٹن دبا کر 1/100 سیکنڈ میں اس مُسکراہٹ کو بقائے دوام بخشنے والے تھے کہ پھاٹک کی گھنٹی اس زور سے بجی کی سیفو اُچھل کر کیمرے پر گری اور کیمرہ قالین پر۔ ہر دو کو اسی حالت میں چھوڑ کر ہم نا وقت آنے والوں کے استقبال کو دوڑے۔

حج کا ثواب نذرکرُوں گا حضُور کی

پھاٹک پر شیخ محمّد شمس الحق کھڑے مُسکرا رہے تھے۔ ان کے پہلُو سے روئی کے دگلے میں ملفُوف ومستُور ایک بزرگ ہَویدا ہُوئے، جن پر نظر پڑتے ہی ناجیہ تالی بجا کے کہنے لگی:

''ہائے! کیسا کیوٹ سینٹا کلاز ہے!''

یہ شیخ محمّد شمس الحق کے مامُوں جان قبلہ نکلے، جو حج کو تشریف لے جا رہے تھے اور ہمیں ثواب دارین میں شریک کرنے کے لئے موضع چاکسو (خُورد) سے اپنا پاسپورٹ فوٹو کھنچوانے آئے تھے۔

''مامُوں جان تو بضد تھے کہ فوٹو گرافر کے پاس لے چلو۔ بلا سے پیسے لگ جائیں، تصویر تو ڈھنگ کی آئے گی۔ بڑی مشکلوں سے رضا مند ہوئے ہیں یہاں آنے پر'' اُنھوں نے شانِ نُزولِ اجلال بیان کی۔

ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی شیخ محمّد شمس الحق صاحب کے مامُوں جان قبلہ دیواروں پر قطار اندر قطار آویزاں تصویرِ بتاں کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھنے لگے۔ ہر تصویر کو دیکھنے کے بعد مُڑکر ایک دفعہ ہماری صورت ضرور دیکھتے۔ پھر دوسری تصویر کی باری آتی۔ اور ایک دفعہ پھر ہم پر وہ نگاہ ڈالتے، جو کسی طرح غلط انداز نہ تھی۔ جیسی نظروں سے وہ یہ تصویریں دیکھ رہے تھے، ان سے ظاہر ہوتا تھا کہ صاحبِ نظر کا تعلّق اُس نسل سے ہے جس نے کلدار رُوپے پر بنی ہوئی ملکہ وکٹوریہ کے بعد کسی عورت کی تصویر نہیں دیکھی۔ ایک بانکی سی تصویر کو ذرا قریب جاکر دیکھا۔ لاحول پڑھی۔ اور پوچھا، یہ آپ کے لڑکے نے کھینچی ہے؟ عرض کیا، جی، نہیں! وہ تو تین سال سے ساتویں میں پڑھ رہا ہے۔ بولے ہمارا بھی یہی خیال تھا، مگر احتیاطاً پوچھ لیا۔

شیخ محمّد شمسُ الحق صاحب کے مامُوں جان قبلہ (اپنی اور کاتب کی سہُولت کے مدِّ نظر آیندہ انھیں فقط 'مامُوں' لکھا جائے گا۔ جن قارئین کو ہمارا اختصار ناگوار گُزرے، وہ ہر دفعہ 'مامُوں' کے بجائے شیخ محمّد شمس الحق صاحب کے مامُوں جان قبلہ، پڑھیں) ہماری رہبری کے لئے اپنے تایا ابّا مرحوم کی ایک مِٹی مِٹائی تصویر ساتھ لائے تھے۔ شیشم کے فریم کو حِنائی انگوچھے سے جھاڑتے ہوئے بولے ''ایسی کھینچ دیجیے''۔ ہم نے تصویر کو غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ مامُوں کے عمِّ بزرگوار بھی وہی روئی کا دگلا پہنے کھڑے ہیں، جس پر اُلٹی کیریا ں بنی ہوئی ہیں۔ تلوار کو بڑی مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے ـــــ جھاڑو کی طرح۔ عرض کیا، قبلہ! پاس پورٹ فوٹو میں تلوار کی اجازت نہیں۔ فرمایا، آپ کو ہمارے ہاتھ میں تلوار نظر آرہی ہے؟ ہم بہت خفیف ہوئے۔ اس لئے کہ مامُوں کے ہاتھ میں واقعی کچھ نہ تھا۔ بجُز ایک بے ضرر گُلاب کے، جسے سونگھتے ہوئے وہ پاسپورٹ فوٹو کھنچوانا چاہتے تھے۔

مامُوں کے کان 'ط' کی مانند تھے ـــــ باہر کو نکلے ہوئے۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم جسمانی عیوب کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔ در حقیقت اس تشبیہ سے ہمیں کانوں کی افادیت دکھانی مقصود ہے۔ کیوں کہ خدا نخواستہ کانوں کی ساخت ایسی نہ ہوتی تو ان کی ترکی ٹوپی سارے چہرے کو ڈھانک لیتی۔ ابتدائی تیاریوں کے بعد

بڑی منّتوں سے اُنھیں فوٹو کے لئے کرسی پربٹھایا۔ کسی طرح نہیں بیٹھتے تھے۔ کہتے تھے ''بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ کھڑے رہیں اور میں بیٹھ جاؤں۔''خدا خدا کر کے وہ بیٹھے تو ہم نے دیکھا کہ ان کی گردن ہلتی ہے۔ ظاہر ہے،ہمیں فطری رعشے پر کیا اعتراض ہو سکتاتھا۔ اصل مصیبت یہ تھی کہ گردن اگر دو سیکنڈ ہلتی تو ٹوپی کا پھُندنا دو منٹ تک ہلتا رہتا۔ ہر دو عمل کے ایک نایاب وقفے میں ہم نے''ریڈی'' کہا تو گویا عالم ہی کُچھ اور تھا۔ ایک دم اکڑ گئے اور ایسے اکڑے کہ جسم پر کہیں بھی ہتھوڑی مار کر دیکھیں تو ٹن ٹن آواز نکلے۔ ڈیڑھ دو منٹ بعد تیسری دفعہ 'ریڈی' کہہ کرکیمرے کے دید بان (VIEW-FINDER) سے دیکھا تو چہرے سے خوف آنے لگا۔ گردن پر ایک رسّی جیسی رگ نہ جانے کہاں سے اُبھر آئی تھی۔ چہرہ لال۔ آنکھیں اس سے زیادہ لال۔یکلخت ایک عجیب آواز آئی۔ اگر ہم ان کے مُنہ کی طرف نہ دیکھ رہے ہوتے تو یقیناً یہی سمجھتے کہ کسی نے سائیکل کی ہوا نکال دی ہے۔

''اب تو سانس لے لوں؟'' سارے کمرے کی ہوا اپنی ناک سے پمپ کرتے ہوئے پوچھنے لگے۔ اب سوال یہ نہیں تھا کہ تصویر کیسی اور کس پوز میں کھینچی جائے۔ سوال یہ تھا کہ ان کا عملِ تنفّس کیوں کر برقرار رکھّا جائے کہ تصویر بھی کھنچ جائے اور ہم قتلِ عمد کے مرتکب بھی نہ ہوں۔ اپنی نگرانی میں اُنھیں دو چار ہی سانس لوائے تھے کہ مسجد سے مؤذّن کی صدا بلند ہوئی۔ اور پہلی 'اللہ اکبر' کے بعد، مگر دوسری سے پہلے، مامُوں کرسی سے ہڑبڑا کے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ شیشے کے جگ سے وضو کیا۔ پوچھا، قبلہ کس طرف؟ ہمارے مُنہ سے نکل گیا مغرب کی طرف۔ فرمایا، ہمارا بھی یہی خیال تھا، مگر احتیاطاً پوچھ لیا۔ اس کے بعد جا نماز طلب کی۔

مامُوں نے پلنگ پوش پرظُہر کی نماز قائم کی۔آخر میں بآواز بلند دُعا مانگی،جسے وہ لوگ،جن کا ایمان قدرے ضعیف ہو، فرمائشوں کی فہرست کہہ سکتے ہیں۔ نماز سے فارغ ہوئے تو ہمیں مخاطب کرکے بڑی نرمی سے بولے''چار فرضوں کے بعد دو سُنّتیں پڑھی جاتی ہیں۔تین سُنّتیں کسی نماز میں نہیں پڑھی جاتیں۔ کم از کم مسلمانوں میں!''

دوسرے کمرے میں طعام وقیلُولہ کے بعد چاندی کی خلال سے حسبِ عادتِ قدیم اپنے مصنُوعی دانتوں کی رتخیں کُریدتے ہوئے بولے، ''بیٹا! تمہاری بیوی بہت سُگھڑ ہے۔ گھر بہت ہی صاف سُتھرا رکھتی ہے۔ بالکل ہسپتال لگتا ہے۔'' اس کے بعد ان کی اور ہماری مُشترکہ جانکنی پھر شروع ہوئی۔ ہم نے کہا ''اب تھوڑا رلیکس (RELAX) کیجئے۔'' بولے، ''کہاں کروں؟'' کہا، ''میرامطلب ہے، بدن ذرا ڈھیلا چھوڑ دیجیے۔ اور یہ بھول جائیے کہ آپ کیمرے کے سامنے بیٹھے ہیں۔'' بولے، ''اچھا! یہ بات ہے!'' فوراً بندھی ہوئی مُٹھّیاں کھول دیں۔ آنکھیں جھپکائیں اورپھیپھڑوں کو اپنا قُدرتی فعل پھر شروع کرنے کی اجازت دی۔ ہم نے اس ''نیچرل پوز'' سے فائدہ اُٹھانے کی غرض سے دوڑ دوڑ کر ہر چیز کو آخری ''ٹچ'' دیا، جس میں یہ بندھاٹکا فقرہ بھی شامل تھا، ''ادھر دیکھیے۔ میری طرف۔ ذرا مُسکرائیے!'' بٹن دباکر ہم ''شکریہ'' کہنے والے تھے کہ یہ دیکھ کر ایرانی قالین پیروں تلے سے نکل گیا کہ وہ ہمارے کہنے سے پہلے ہی خدا جانے کب سے رلیکس کرنے کی غرض سے اپنی بتّیسی ہاتھ میں لیے ہنسے چلے جا رہے تھے۔ ہم نے کہا ''صاحب! اب نہ ہنسیے!'' بولے'' تو پھر آپ سامنے سے ہٹ جائیے!''

ہمیں ان کے سامنے سے ہٹنے میں زیادہ سوچ بچار نہیں کرنا پڑا۔ اس لئے کہ اُسی وقت ننھی ناجیہ دوڑی دوڑی آئی اور ہماری آستین کا کونہ کھینچتے ہوئے کہنے لگی ''انکل! ہری اپ!پلیز! جا نماز پہ بلّی پنجوں سے وضو کر رئی ہے! ہائے اللہ! بڑی کیوٹ لگ رئی ہے!''

پھر ہم اس منظر کی تصویر کھینچنے اور مامُوں لاحول پڑھنے لگے۔

اگلے اتوار کو ہم پروفیسر قاضی عبدُالقدُّوس کے فوٹو کی ''ری ٹچنگ'' میں جُٹے ہوئے تھے۔ پتلُون کی پندرھویں سِلوَٹ پر کلف اِستری کر کے اب ہم ہونٹ کا مسّا چھُپانے کے لئے صفر نمبر کے برش سے مونچھ بنانے والے تھے کہ اتنے میں مامُوں اپنی تصویریں لینے آدھمکے۔ تصویریں کیسی آئیں، اس کے مُتعلّق ہم اپنے مُنہ سے کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ مکالمہ خود چٹاخ پٹاخ بول اُٹھے گا:

'' ہم ایسے ہیں؟''

'' کیا عرض کروں!''

''تمہیں کس نے سِکھایا تصویر کھینچنا؟''

''جی! خود ہی کھینچنے لگ گیا۔''

''ہمارا بھی یہی خیال تھا ۔ مگر احتیاطاً پوچھ لیا۔''

''آخر تصویر میں کیا خرابی ہے؟''

''ہمارے خیال میں یہ ناک ہماری نہیں ہے۔''

ہم نے اُنھیں مُطّلع کیا کہ اُن کے خیال اور اُن کی ناک میں کوئی مُطابقت نہیں ہے۔ اس پر اُنھوں نے یہ جاننا چاہا کہ اگر تصویر کو خوب بڑا کیا جائے، تب بھی ناک چھوٹی نظر آئے گی کیا؟

پندِ سُود مند

دوسرے دن مرزا ایک نئی طرز کے ہوٹل ''مانٹی کارلو'' کے بال رُوم میں اُتاری ہوئی تصویریں دِکھانے آئے۔ اور ہر تصویر پر ہم سے اس طرح داد وصول کی جیسے مرہٹے چوتھ وصول کیا کرتے تھے۔ یہ اِسپین کی ایک اسٹرپ ٹیز ڈانسر (جسے مرزا اُندلُسی رقّاصہ کہے چلے جا رہے تھے) کی تصویریں تھیں، جنھیں برہنہ تو نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اس لئے کہ سفید دستانے پہنے ہوئے تھی۔ گرم کافی اور تحسین ناشناس سے ان کی طبیعت میں انشراح پیدا ہونے لگا تو موقع غنیمت جان کر ہم نے مامُوں کی زیادتیاں گوش گُزار کیں اورمشورہ طلب کیا۔ اب مرزا میں بڑی پُرانی کمزوری یہ ہے کہ اُن سے کوئی مشورہ مانگے تو ہاں میں ہاں ملانے کے بجائے سچ مچ مشورہ ہی دینے لگ جاتے ہیں۔ پھر یہ بھی کہ ہماری صورت میں کوئی ایسی بات ضرور ہے کہ ہر شخص کا بے اختیار نصیحت کو جی چاہتا ہے۔ چنانچہ پھر شروع ہو گئے:

''صاحب! آپ کو فوٹو کھینچنا آتا ہے، فوٹو کھنچوانے والوں سے نمٹنا نہیں آتا۔ سلامتی چاہتے ہو تو کبھی اپنے سامنے فوٹو دیکھنے کا موقع نہ دو۔ بس دبیز لفافے میں بند کر کے ہاتھ میں تھما دو اور چلتا کرو۔ وکٹوریہ روڈ کے چوراہے پر جو فوٹو گرافر ہے۔ لمسنیا ڈاڑھی والا۔ ارے بھئی! وہی جس کی ناک پر چاقو کا نشان ہے۔ آگے کا دانت ٹوٹا ہوا ہے۔ اب اس نے بڑا پیارا اصول بنایا ہے۔ جو گاہک دوکان پر اپنی تصویر نہ دیکھے، اسے بِل میں

25 فیصد نقد رعایت دیتا ہے۔ اور ایک تم ہو کہ مُفت تصویر کھینچتے ہو۔ اور شہر بھر کے بدصورتوں سے گالیاں کھاتے پھرتے ہو۔ آج تک ایسا نہیں ہُوا کہ تم نے کسی کی تصویر کھینچی ہو اور وہ ہمیشہ کے لئے تمہارا جانی دُشمن نہ بن گیا ہو۔''

کثرتِ آولاد اور یہ فقیرِ پُرتقصیر

نصیحت کی دُھن میں مرزا یہ بھول گئے کہ دُشمنوں کی فہرست میں اضافہ کرنے میں خود اُنھوں نے ہمارا ہاتھ بٹایا ہے۔ جس کا اندازہ اگر آپ کو نہیں ہے تو آنے والے واقعات سے ہو جائیگا۔ ہم سے کچھ دور پی۔ڈلیو۔ڈی کے ایک نامی گرامی ٹھیکیدار تین کوٹھیوں میں رہتے ہیں۔ مارشل لاء کے بعد سے بچارے اتنے رقیق القلب ہوگئے ہیں کہ برسات میں کہیں سے بھی چھت گرنے کی خبر آئے، ان کا کلیجہ دھک سے رہ جاتا ہے۔ حُلیہ ہم اس لئے نہیں بتائیں گے کہ اسی بات پر مرزا سے بُری طرح ڈانٹ کھا چکے ہیں ـــــ ''ناک فلپس کے بلب جیسی، آواز میں بنک بلنیس کی کھنک، جسم خُوبصورت صراحی کے مانند ـــــ یعنی وسط سے پھیلا ہُوا ـــــ'' ہم نے آؤٹ لائن ہی بنائی تھی کہ مرزا گھائل لہجے میں بولے، ''بڑے مزاح نگار بنے پھرتے ہو۔ تمہیں اتنا بھی معلوم نہیں کہ جسمانی نقائص کا مذاق اُڑانا طنز ومزاح نہیں۔ ''کروڑ پتی ہیں، مگر اِنکم ٹیکس کے ڈر سے اپنے آپ کو لکھ پتی کہلواتے ہیں۔ مبدء فیّاض نے ان کی طبیعت میں کنجوسی کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے۔ روپیہ کمانے کو تو سبھی کماتے ہیں۔ وہ رکھنا بھی جانتے ہیں۔ کہتے ہیں، آمدنی بڑھانے کی سہل ترکیب یہ ہے کہ خرچ گھٹا دو۔ مرزا سے روایت ہے کہ اُنھوں نے اپنی بڑی بیٹی کو اس وجہ سے جہیز نہیں دیا کہ اس کی شادی ایک ایسے شخص سے ہوئی، جو خود لکھ پتی تھا۔ اور دوسری بیٹی کو اس لئے نہیں دیا کہ اس کا دولھا دوالیہ تھا۔ سال چھ مہینے میں ناک کی کیل تک بیچ کھاتا۔ غرض لکشمی گھر کی گھر میں رہی۔

ہاں، تو انھی ٹھیکیدار صاحب کا ذکر ہے، جن کی جائدادِ منقُولہ وغیرمنقُولہ، منکُوحہ وغیرمنکُوحہ کا نقشہ شاعرِ شیوہ بیاں نے ایک مصرع میں کھینچ کر رکھ دیا ہے:

ایک اک گھر میں سو سو کمرے، ہرکمرے میں نار

اس حسین صورتِ حال کے نتائج اکثر ہمیں بھگتنے پڑتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ ہر نو مولُود کے عقیقہ اور پہلی سال گرہ پر ہمیں سے یاد گار تصویر کھنچواتے ہیں۔ اور یہی کیا کم ہے کہ ہم سے کچھ نہیں لیتے۔ ادھر ڈھائی تین سال سے اتنا کرم اور فرمانے لگے ہیں کہ جیسے ہی خاندانی منصوبہ شِکنی کی شُبھ گھڑی قریب آتی ہے تو ایک نوکر، دائی کو اور دوسرا ہمیں بُلانے دوڑتا ہے،بلکہ ایک آدھ دفعہ ایسا بھی ہوا کہ ''وہ جاتی تھی کہ ہم نکلے'' ۔ جن حضرات کو اس بیان میں شرارتِ ہمسایہ کی کار فرمائی نظر آئے، وہ ٹھیکیدار صاحب کے البم مُلاحظہ فرما سکتے ہیں۔ ہمارے ہاتھ کی ایک نہیں، درجنوں تصویریں ملیں گی، جن میں موصُوف کیمرے کی آنکھ میں آنکھیں ڈال کر نو مولُود کے کان میں اذان دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

آئے دن کی زچگیاں جھیلتے جھیلتے ہم ہلکان ہو چکے تھے، مگر بوجہِ شرم وخوش اَخلاقی خاموش تھے۔ عقل کام نہیں کرتی تھی کہ اس کاروبارِ شوق کو کس طرح بند کیا جائے۔ مجبوراً (انگریزی مُحاوَرے کے مُطابق) مرزا کو اپنےاعتماد میں لیناپڑا۔ احوال پُرملال سُن کر بولے، صاحب! اِن سب پریشانیوں کا حل ایک پھُولدار فراک ہے۔ ہم نے کہا، مرزا! ہم پہلے ہی ستائے ہوئے ہیں۔ ہم سے یہ ابسٹریکٹ گفتگو تو نہ کرو۔ بولے، تمہاری ڈھلتی جوانی کی قسم! مذاق نہیں کرتا۔ تمہاری طرح ہمسایوں کے لختِ ہائے جگر کی تصویریں کھینچتے کھینچتے اپنا بھی بھُرکس نکل گیا تھا۔ پھر میں نے تو یہ کیا کہ ایک پھُولدار فراک خریدی اور اس میں ایک نوزائیدہ بچّے کی تصویر کھینچی۔ اوراس کی تین درجن کاپیاں بنا کر اپنے پاس رکھ لیں۔ اب جو کوئی اپنے نو مولُود کی تصویر کی فرمائش کرتا ہے تو یہ شرط لگا دیتا ہوں کہ اچھی تصویر درکار ہے تویہ خوبصورت پھُولدار فراک پہنا کر کھنچواؤ۔ پھر کیمرے میں فلم ڈالے بغیربٹن دباتا ہوں۔ اور دو تین دن کا بھُلاوا دے کر اِسی اُمّ التّصاویر کی ایک کاپی پکڑا دیتا ہوں۔ ہر باپ کو اس میں اپنی شباہت نظر آتی ہے!

حادثات اوراِبتدائی قانونی اِمداد

ہمارے پُرانے جاننے والوں میں آغا واحد آدمی ہیں، جن سے ابھی تک ہماری بول چال ہے۔ اس کی واحد وجہ مرزا یہ بتاتے ہیں کہ ہم نے کبھی ان کی تصویر نہیں کھینچی، گو کہ ہماری فنکارانہ صلاحیتوں سے وہ

بھی اپنے طورپر مُستفید ہو چکے ہیں۔ صورتِ استفادہ یہ تھی کہ ایک اتوار کو ہم اپنے ''ڈارک رُوم'' (جسے پیر سے سنیچر تک گھر والے غُسلخانہ کہتے ہیں) میں اندھیرا کیے ایک مارپیٹ سے بھرپور سیاسی جلسے کے پرنٹ بنا رہے تھے۔ گُھپ اندھیرے میں ایک مُنّا سا سُرخ بلب جل رہا تھا، جس سے بس اتنی روشنی نکل رہی تھی کہ وہ خود نظر آجاتا تھا۔ پہلے پرنٹ پر کالی جھنڈیاں صاف نظر آنے لگیں تھیں، لیکن لیڈر کا چہرہ کسی طرح اُبھر کے نہیں دیتا تھا۔ لہٰذا ہم اسے بار بار چمٹی سے تیزابی محلُول میں غوطے دیے جا رہے تھے۔ اتنے میں کسی نے پھاٹک کی گھنٹی بجائی اور بجاتا چلا گیا۔ ہم جس وقت چمٹی ہاتھ میں لیے پہنچے ہیں، تو گھر والے ہی نہیں، پڑوسی بھی دوڑ کر آ گئے تھے۔ آغا نے ہتھیلی سے گھنٹی کا بٹن دبا رکھا تھا اور لرزتی کپکپاتی ہوئی آواز میں حاضرین کو بتا رہے تھے کہ وہ کس طرح اپنی سدھی سدھائی مرنجاں مرنج کار[1] میں اپنی راہ چلے جا رہے تھے کہ ایک ٹرام دندناتی ہوئی ''رانگ سائیڈ'' سے آئی۔ اور ان کی کار سے ٹکرا گئی۔ ہمارے مُنھ سے کہیں نکل گیا، ''مگر تھی تو اپنی ہی پٹڑی پر؟'' تنتناتے ہوئے بولے ''جی، نہیں! ٹیک آف کر کے آئی تھی!'' یہ موقع ان سے اُلجھنے کا نہیں تھا،اس لیے کہ وہ جلدی مچا رہے تھے۔ بقول ان کے رہی سہی عزّت خاکِ کراچی میں ملی جارہی تھی۔ اور اسی کی خاطر ٹکر ہونے سے ایک دو سیکنڈ پہلے ہی وہ کار سے کود کرغریب خانہ کی سمت روانہ ہوگئے تھے تاکہ چالان ہوتے ہی اپنی صفائی میں بطور دلیل نمبر ۲ حادثہ کا فوٹو مع فوٹو گرافر پیش کرسکیں۔ دلیل نمبر ا یہ تھی کہ جس لمحے کار ٹرام سے ٹکرائی، وہ کارمیں موجود ہی نہیں تھے۔

ہم جس حال میں تھے، اسی طرح کیمرہ لے کر آغا کے ساتھ ہو لیے اور ہانپتے کانپتے موقع واردات پر پہنچے۔ دیکھا کہ آغا کی کار کا بمپر ٹرام کے بمپر پر چڑھا ہوا ہے۔ اگلا حصّہ ہوا میں معلّق ہے اور ایک لونڈا پہیا گُھما گُھما کر دوسرے سے کہہ رہا ہے ''ابے فضلو! اس کے تو پہیّے بھی ہیں!''

---

[1] اِس پُرانی کار کا خاکہ ایک دوسرے مضمون میں ملاحظہ فرمائیے۔ سرِدست اتنا اشارہ کافی ہوگا کہ آغا اس میں نکلتے ہوئے اس قدر جھینپتے ہیں کہ کبھی ہارن نہیں بجاتے۔ آخر غیروں کے طعنوں اور دوستوں کی پھبتیوں سے تنگ آکر آغا ایک دن نئی کار خریدنے نکلے۔ بیسیوں کاریں دیکھ ڈالیں۔ صرف ایک پسند آئی۔ کہنے لگے، '' یہ ٹھیک رہے گی۔ اس کا بمپر بہت مضبوط ہے!'' سیلز گرل نے ساٹھ ہزار چار سو قیمت بتائی۔ لیکن سودا نہ ہو سکا۔ اس لئے کہ آغا کا خیال تھا کہ اس قیمت کی کار کو تو بغیر پٹرول کے چلنا چاہیے۔

آغا کا اصرار تھا کہ تصویریں ایسے زاویئے سے لی جائیں، جس سے ثابت ہو کہ پہلے مُشتعل ٹرام نے کار کے ٹکر ماری۔ اس کے بعد کار ٹکرائی! وہ بھی محض حفاظتِ خود اختیاری میں! ہم نے احتیاطاً ملزمہ کے ہر پوز کی تین تین تصویریں لے لیں، تاکہ ان میں مبیّنہ زاویہ بھی، اگر کہیں ہو، تو آ جائے۔ حادثے کو فلماتے وقت ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ اس پیش بندی کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ اس لئے کہ جس زاویئے سے مضروبہ ملزمہ پر چڑھی تھی اور جس پینترے سے آغا نے ٹرام اور قانون سے ٹکر لی تھی، اسے دیکھتے ہوئے ان کا چالان اقدامِ خودکشی میں بھلے ہی ہو جائے، ٹرام کو نقصان پہنچانے کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ادھر ہم کلک کلک تصویر پر تصویر لیے جا رہے تھے، ادھر سڑک پر تماشائیوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ ہم نے کیمرے میں دوسری فلم ڈالی۔ اور کار کا ''کلوز اپ'' لینے کی غرض سے مرزا ہمیں سہارا دے کر ٹرام کی چھت پر چڑھانے لگے۔ اتنے میں ایک گبرو پولیس سارجنٹ بھیڑ کو چیرتا ہوا آیا۔ آ کر ہمیں نیچے اتارا۔ اور نیچے اتار کے چالان کر دیا ـــــ شارعِ عام پر مجمع لگا کے عمداً رُکاوٹ پیدا کرنے کے الزام میں! اور بقول مرزا، وہ تو بڑی خیریت ہوئی کہ وہ وہاں موجود تھے۔ ورنہ ہمیں تو کوئی ضمانت دینے والا بھی نہ ملتا۔ کھِنچے کھِنچے پھرتے۔

عقدِ ثانی اور عاجز

یہ پہلا اور آخری موقع نہیں تھا کہ ہم نے اپنے حقیر آرٹ سے قانون اور انصاف کے ہاتھوں کو مضبوط کیا۔ (معاف کیجئے۔ ہم پھر انگریزی ترکیب استعمال کر گئے۔ مگر کیا کیا جائے، انگریزوں سے پہلے ایسا بجوگ بھی تو نہیں پڑتا تھا) اپنے بے گانوں نے بارہا یہ خدمت بے مُزد ہم سے لی ہے۔ تین سال پہلے کا ذکر ہے۔ عائلی قانون (جسے مرزا قانونِ انسدادِ نکاح کہتے ہیں) کا نفاذ ابھی نہیں ہوا تھا۔ مگر پریس میں اس کی موافقت میں تحریریں اور تقریریں دھڑا دھڑ چھپ رہی تھیں۔ جن کے گُجراتی ترجموں سے گڑ بڑا کر ''بنولہ کنگ'' سیٹھ عبدُل غفُور ابراہیم حاجی محمّد اسمعیل یونس چھابڑی والا ایک لڑکی سے چوری چھپے نکاح کر بیٹھے تھے۔ حلیہ نہ پوچھیں تو بہتر ہے۔ اہل بنیش کو اتنا اشارہ کافی ہونا چاہیے کہ اگر ہم ان کا حلیہ ٹھیک ٹھیک بتانے لگیں تو مرزا چیخ اٹھیں گے ''صاحب! یہ طنز ومزاح نہیں ہے!'' اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم ان کو حقارت کی نظر سے

دیکھتے ہیں۔ حاشا وکلاّ۔ ہم نے کچھ عرصے سے یہ اصول بنا لیا ہے کہ کسی انسان کو حقارت سے نہیں دیکھنا چاہیے۔ اس لئے کہ ہم نے دیکھا کہ جس کسی کو ہم نے حقیر سمجھا، وہ فوراً ترقی کرگیا۔ ہاں تو ہم یہ کہہ رہے تھے کہ جس دن سے تعدّدِ اَزدواج کا قانون لاگو ہونے والا تھا،ا س کی ''چاند رات'' کو سیٹھ صاحب غریب خانے پر تشریف لائے۔انتہائی سراسمیگی کے عالم میں۔ان کے ہمراہ وجہِ سراسمیگی بھی تھی۔جو سیاہ بُرقع میں تھی۔اوربہت خوب تھی۔

رات کے دس بج رہے تھے۔اورکیمرہ، اسکرین اور روشنیاں ٹھیک کرتے کرتے گیارہ بج گئے۔گھنٹہ بھر تک سیٹھ صاحب ہماری CANDID FIGURE STUDIES کو اس طرح گھورتے رہے کہ پہلی مرتبہ ہمیں اپنے فن سے حجاب آنے لگا۔ فرمایا، اجُن بگڑیلی بائیوں کی پھوٹو گراپھ لینے میں تو تم ایک نمبر اُستاد ہو۔ پن کوئی بھین بیٹی کپڑے پہن کر فوٹو کھچوائے تو کیا تمیرا کیمرا کام کریں گا؟ ہم نے کیمرے کی نیک چلنی کی ضمانت دی اور تپائی رکّھی۔ تپائی پر سیٹھ صاحب کو کھڑا کیا۔ اور ان کے بائیں پہلو میں دُلہن کو (سینڈل اُتروا کر) کھڑا کر کے فوکس کر رہے تھے کہ وہ تپائی سے چھلانگ لگا کر ہمارے پاس آئے اور ٹوٹی پھوٹی اردو میں، جس میں گُجراتی سے زیادہ گھبراہٹ کی آمیزش تھی، درخواست کی کہ سُرمئی پردے پر آج کی تاریخ کوئلے سے لکھ دی جائے اور فوٹو اس طرح لیا جائے کہ تاریخ صاف پڑھی جا سکے۔ ہم نے کہا، سیٹھ! اس کی کیا تُک ہے؟ تپائی پر واپس چڑھ کے اُنھوں نے بڑے زور سے ہمیں آنکھ ماری اور اپنی ٹوپی کی طرف ایسی بے کَسی سے اشارہ کیا کہ ہمیں ان کے ساتھ اپنی عزّت آبرو بھی مٹی میں ملتی نظر آئی۔ پھر سیٹھ صاحب اپنا بایاں ہاتھ دُلہن کے کندھے پر مالکانہ انداز سے رکھ کر کھڑے ہو گئے۔ دایاں ہاتھ اگر اور لمبا ہوتا تو بخُدا اسے بھی وہیں رکھ دیتے۔فی الحال اُس میں جلتا ہوا سگریٹ پکڑے ہوئے تھے۔ ہمارا ''ریڈی'' کہنا تھا کہ تپائی سے پھر زقند لگا کر ہم سے لپٹ گئے۔ یا اللہ! خیر! اب کیا لَفڑا ہے سیٹھ؟ معلوم ہوا، اب کی دفعہ بچشمِ خود یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ وہ کیمرے میں کیسے نظر آ رہے ہیں! خُوشامد درامد کر کے پھر تپائی پر چڑھایا۔ اور قبل اس کے کہ گھڑیال رات کے بارہ بجا کر نئی صبح اور قانونِ انسداد نکاح کے نفاذ کا اعلان کرے، ہم نے اُن کے خُفیہ رشتہء مُناکحت کا مزید دستاویزی ثبوت کو ڈک فلم پر محفوظ کرلیا۔

اصل دشواری یہ تھی کہ تصویر کھینچنے اور کھنچوانے کے آداب سے متعلّق جو ہدایات سیٹھ صاحب بزُبان گُجراتی یا اشاروں سے دیتے رہے، ان کا منشاء کم از کم ہمارے فہمِ ناقص میں یہ آیا کہ دُلہن صرف اُس لمحے نقاب اُلٹے جب ہم بٹن دبائیں۔ اور جب ہم بٹن دبائیں تو عینک اُتار دیں۔ان کا بس چلتا تو کیمرے کا بھی 'لینس' اُتروا کر تصویر کھنچواتے۔

رات کی جگار سے طبیعت تمام دن کسلمند رہی۔ لہذا دفتر سے دو گھنٹے پہلے ہی اُٹھ گئے۔ گھر پہنچے تو سیٹھ صاحب ممدُوح ومنکُوح کو برآمدے میں ٹہلتے ہوئے پایا۔ گردن جھکائے، ہاتھ پیچھے کو باندھے، بے قراری کے عالم میں ٹہلے چلے جا رہے تھے۔ ہم نے کہا، سیٹھ ، السلامُ علیکُم! بولے،بالیکُم! پن پھلَم کو گُسل کب دیں گا؟ ہم نے کہا، ابھی لو، سیٹھ! پھر اُنھوں نے خواہش ظاہر کی کہ ان کی شریکِ حیات کی تصویر کو ان کی موجودگی میں ''غسل'' دیا جائے ۔ہم نے جگہ کی تنگی کا عُذر کیا، جس کے جواب میں سیٹھ صاحب نے ہمیں بنولے کی ایک بوری دینے کا لالچ دیا۔ جتنی دیر تک فلم ڈویلپ ہوتی رہی، وہ فلش کی زنجیر سے لٹکے، اس گُنہ گار کی نقل وحرکت کی کڑی نگرانی کرتے رہے۔

ہم ''فکسر''میں آخری ڈوب دے چکے تو اُنھوں نے پوچھا ''کلیر آئی ہے؟'' عرض کیا، بالکل صاف۔ چوبی گیرہ سے ٹپکتی ہوئی فلم پکڑ کے ہم نے اُنھیں بھی دیکھنے کا موقع دیا۔ شارک اسکن کا کوٹ ہی نہیں بریسٹ پاکٹ کے بٹوے کا اُبھار بھی صاف نظر آ رہا تھا۔ تاریخ نگیٹو میں اُلٹی تھی، مگر صاف پڑھی جا سکتی تھی۔ چہرے پر بھی بقول اُن کے کافی روشنائی تھی۔ اُنھوں نے جلدی جلدی دُلہن کی انگوٹھی کے نگ گنے اور اُنھیں پورے پاکر ایسے مطمئن ہوئے کہ چٹکی بجاکر سگرٹ چھنگلیا میں دبا کے پینے لگے۔ بولے،''مشٹر! یہ تو سولہ آنے کلئیر ہے۔ آنکھ، ناک، جیب پاکٹ، ایک ایک نگ چگٹی سنبھال لو۔ اپنے بہی کھاتے کے مواپھک! اجُن اپنی اومیگا واچ کی سوئی بھی بروبر ٹھیک ٹیم دیتی پڑی ہے۔ گیارہ کلاک۔اور اپن کے ہاتھ میں جو ایک ٹھو سگرٹ جلتا پڑا ہے، وہ بھی سالا ایک دم لیٹ مارتا ہے۔'' یہ کہہ کر وُہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ پھرایک جھٹکے سے چہرہ اُٹھا کر کہنے لگے ''بڑے صاب!اس سگرٹ پہ جو سالا K2 لکھے لا ہے،اس کی جگہ Player's No. 3. بنا دو نی!''

دربارِاکبری میں باریابی

خیر،یہاں تو معاملہ سگرٹ ہی پر ٹل گیا، ورنہ ہمارا تجربہ ہے کہ سو فی صد حضرات اور ننانوے فیصد خواتین تصویر میں اپنے آپ کو پہچاننے سے صاف انکار کر دیتے ہیں۔ باقی رہیں ایک فی صد۔ سو اُنھیں اپنے کپڑوں کی وجہ سے اپنا چہرہ قبُولنا پڑتا ہے۔ لیکن اگر اتّفاق سے کپڑے بھی اپنے نہ ہوں تو پھر شوقیہ فوٹو گرافر کو چاہیے کہ اور روپیہ برباد کرنے کا کوئی اور مشغلہ تلاش کرے، جس میں کم از کم مارپیٹ کا امکان تو نہ ہو۔ اس فن میں دَرک نہ رکھنے والوں کی آنکھیں کھولنے کے لئے ہم صرف ایک واقعہ بیان کرتے ہیں۔ پچھلے سال بغدادی جم خانہ میں تمبولا سے تباہ ہونے والوں کی امداد کے لئے یکُم اپریل کو ''اکبرِاعظم'' کھیلا جانے والا تھا اور پبلسٹی کمیٹی نے ہم سے درخواست کی تھی کہ ہم ڈریس ریہرسل کی تصویریں کھینچیں تاکہ اخبارات کو دو دن پہلے مہیّا کی جا سکیں۔

ہم ذرا دیر سے پہنچے۔ چوتھا سین چل رہا تھا۔ اکبرِ اعظم دربار میں جلوہ افروز تھے اور اُستاد تان سین بینجو پر حضرتِ فراقؔ گورکھپُوری کی سِہ غزلہ راگ مالکوس میں گا رہے تھے۔جو حضرات کبھی اس راگ یا کسی سِہ غزلہ کی لپیٹ میں آ چکے ہیں، کچھ وہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اگر یہ دونوں یکجا ہوجائیں تو ان کی سنگت کیا قیامت ڈھاتی ہے۔اکبرِ اعظم کا پارٹ جم خانے کے پروپیگنڈا سیکریٹری صبغے (شیخ صبغتہ اللہ) ادا کررہے تھے۔ سر پر ٹین کا مصنُوعی تاج چمک رہا تھا، جس میں سے اب تک اصلی گھی کی لپٹیں آرہی تھیں۔ تاجِ شاہی پر شیشے کے پیپر ویٹ کا کوہِ نور ہیرا جگمگا رہا تھا۔ ہاتھ میں اُسی دھات یعنی اصلی ٹین کی تلوار۔ جسے گھمسان کا رَن پڑتے ہی دونوں ہاتھوں سے پکڑ کے وہ کُدال کی طرح چلانے لگے۔آگے چل کر ہلدی گھاٹ کی لڑائی میں یہ تلوار ٹوٹ گئی تو خالی نیام سے دادِ شجاعت دیتے رہے۔ انجام کار، یہ بھی جواب دے گیا کہ رانا پرتاپ کا سر اس سے بھی سخت نکلا۔ پھر مہابلی اسکی آخری پچّر تماشائیوں کو دکھاتے ہوئے داروغہ اسلحہ خانہ کو رائج الوقت گالیاں دینے لگے۔حسبِ عادت غُصّے میں آپے سے باہر ہوگئے۔ لیکن حسبِ عادت، مُحاورے کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ دوسرے سین میں شہزادہ سلیم کو آڑے ہاتھوں لیا۔ سلیم ابھی ا۔نار کلی پر اپنا وقت برباد کررہا تھا۔

اُس کا دورِ جہانگیری، بلکہ نُور جہاں گیری ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ دورانِ سرزَنش ظِلِّ سُبحانی نے دستِ خاص سے ایک طمانچہ بھی مارا جس کی آواز آخری قطار تک سُنی گئی۔ طما نچہ تو اَنار کلی کے گال پر بھی مارا تھا، مگر اس کا ذکر ہم نے مصلحتاً نہیں کیا، کیونکہ یہ مہابلی نے کچھ اس انداز سے مارا کہ پاس سے تو کم از کم ہمیں یہی لگا کہ وہ دو منٹ تک انار کلی کا میک اپ سے تمتماتا ہُوا رُخسار سہلاتے رہے۔

پانچوں اُنگلیوں پر گال کے نشان بن گئے تھے!

اکبر: شیخو! انار کلی کا سر تیرے قدموں پر ہے، مگر اُس کی نظر تاج پر ہے۔

سلیم: محبّت اندھی ہوتی ہے، عالم پناہ!

اکبر: مگراس کا یہ مطلب نہیں کہ عورت بھی اندھی ہوتی ہے!

سلیم: لیکن انار کلی عورت نہیں، لڑکی ہے، عالم پناہ!

اکبر: (آستین اور تیوَری چڑھاکر) اے خاندانِ تیمُوریہ کی آخری نشانی! اے نا خلف، مگر (کلیجہ پکڑ کے) اکلوتے فرزند! یاد رکھ میں تیرا باپ بھی ہوں اور والد بھی!

اس ڈرامائی انکشاف کو نئی نسل کی آگاہی کے لئے ریکارڈ کرنا ازبس ضروری تھا۔ لہذا ہم کیمرے میں ،،فلیش گن'' فِٹ کر کے آگے بڑھے۔ یہ احساس ہمیں بہت بعد میں ہُوا کہ جتنی دیر ہم فوکس کرتے رہے، مہابلی اپنا شاہی فریضہ یعنی ڈانٹ ڈپٹ چھوڑ چھاڑ سانس روکے کھڑے رہے۔ وہ جو یکلخت خاموش ہوئے تو پچھلی نشستوں سے طرح طرح کی آوازیں آنے لگیں:

''ابے! ڈائلاگ بھول گیا کیا؟''

''طمانچہ مار کے بیہوش ہوگیا ہے!''

''مہابلی! منھ سے بولو۔''

اگلے سین میں فلمی تکنیک کے مطابق ایک ''فلیش بیک'' تھا۔ مہابلی کی جوانی تھی اوران کی مُونچھوں پر ابھی پاؤڈر نہیں بُرکا گیا تھا۔ باغیِ اعظم، ہیمُو بقّال (تماشائیوں کی طرف مُنہ کرکے) سجدے میں پڑا تھا۔ اورحضرت ظِلّ سُبحانی تلوار سونتے ہُٹّا سا اُس کا سر اُڑانے جا رہے تھے۔ ہم بھی فوٹو کھینچنے لپکے۔ لیکن فٹ لائٹس سے کوئی پانچ گز دور ہوں گے کہ پیچھے سے آواز آئی ـــــ بیٹھ جاؤ، یوسف کا رش! اور اس کے فوراً بعد ایک نامہرباں ہاتھ نے بڑی بے دردی سے پیچھے کوٹ پکڑ کے کھینچا۔ پلٹ کے دیکھا تو مرزا نکلے۔ بولے ''ارے صاحب! ٹھیک سے قتل تو کر لینے دو۔ ورنہ سالا اُٹھ کے بھاگ جائے گا اور پھر علمِ بغاوت بلند کرے گا!''

دوسرے ایکٹ میں کوئی قابل ذکر واقعہ یعنی قتل نہیں ہُوا۔ پانچوں مناظر میں شہزادہ سلیم، انار کلی کو اِس طرح حالِ دل سُناتا رہا، گویا اِملا لکھوا رہا ہے۔ تیسرے ایکٹ میں صبغے، ہمارا مطلب ہے ظِلّ سبحانی، شاہی پیچوان کی گزوں لمبی ربر کی نَے (جس سے دن میں جم خانہ کے لان کو پانی دیا گیا تھا) ہاتھ میں تھامے انار کلی پر برس رہے تھے اور ہم حاضرین کی ہوٹنگ کی ڈر سے ''ونگ'' میں دُبکے ہوئے اس سین کو فِلما رہے تھے کہ سامنے کی ''ونگ'' سے ایک شیرخوار اسٹیج پر گھٹنیوں چلتا ہوا آیا اور گلا پھاڑ پھاڑ کے رونے لگا۔ بلآخر مامتا، عشق اور اداکاری پر غالب آئی اور اِس عفِیفہ نے تختِ شاہی کی اوٹ میں حاضرین سے پیٹھ کر کے اس کا منھ قدرتی غِذا سے بند کیا۔ اُدھر مہابلی خُون کے سے گھونّٹ پیتے رہے۔ ہم نے بڑھ کر پردہ گرایا۔

آخری ایکٹ کے آخری سین میں اکبرِ اعظم کا جنازہ بینڈ باجے کے ساتھ بڑے دھوم دھڑکّے سے نکلا۔ جسے فلمانے کے بعد ہم گرین روم میں گئے اور صبغے کو مبارک باد دی کہ اس سے بہتر مُردے کا پارٹ آج تک ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ اُنھوں نے بطورِ شکریہ کورے کفن سے ہاتھ نکال کر ہم سے مُصافحہ کیا۔ ہم نے کہا صبغے! اور تو جو کُچھ ہُوا، سو ہُوا، مگر اکبر کوہِ نُور ہیرا کب لگاتا تھا؟ کہنے لگے، جبھی تو ہم نے نقلی کوہِ نُور لگایا تھا!

''ڈویلپر'' کو برف سے 70 ڈِگری ٹھنڈا کرکے ہم نے راتوں رات فلم ڈویلپ کی۔ اور دوسرے دن حسبِ وعدہ تصویروں کے پروُف دِکھانے جم خانہ پہنچے۔ گھڑی ہم نے آج تک نہیں رکّھی۔ اندازاً رات کے گیارہ بج رہے ہوں گے۔ اس لئے کے ابھی تو ڈِنر کی میزیں سجائی جا رہی تھیں، اور ان کو زینت بخشنے والے ممبران

''رین بو رُوم'' (بار) میں اُونچے اُونچے اسٹولوں پر ٹنگے نہ جانے کب سے ہماری راہ دیکھ رہے تھے۔ جیسے ہی ممبران ہمارے جامِ صحّت کی آخری بُوند نوش کر چکے،ہم نے اپنے چرمی بیگ سے ''رش پرنٹ'' نکال کر دکھائے ـــــ اورصاحب! وہ تو خُدا نے بڑا فضل کیا کہ ان میں سے ایک بھی کھڑے ہونے کے قابل نہ تھا۔ ورنہ ہر ممبر، کیا مرد، کیا عورت، آج ہمارے قتل میں ماخُوذ ہوتا۔

ظِلّ سبحانی نے فرمایا، ہم نے انارکلی کو اس کی بے راہ رَوی پر ڈانٹتے وقت آنکھ نہیں ماری تھی۔ شہزادہ سلیم اپنا فوٹو مُلاحظہ۔ فرماکر کہنے لگے کہ یہ تو نگیٹو ہے! شیخ ابوالفضل نے کہا، نور جہاں، بیوۂ شیر افگن، تصویر میں سر تا پا مرد افگن نظر آتی ہے۔ راجہ مان سنگھ کڑک کر بولے کہ ہمارے آبِ رواں کے انگرکھے میں ٹوڈرمل کی پسلیاں کیسے نظر آرہی ہیں؟ مُلّا دوپیازہ نے پوچھا، یہ میرے ہاتھ میں دس اُنگلیاں کیوں لگا دیں آپ نے؟ ہم نے کہا، آپ ہِل جوگئے تھے۔بولے، بالکل غلط۔خود آپ کا ہاتھ ہل رہا تھا۔ بلکہ میں نے ہاتھ سے آپ کو اشارہ بھی کیا تھا کہ کیمرہ مضبُوطی سے پکڑیے۔ انارکلی کی والدہ* کہ بڑے کلّے ٹھلّے کی عَورت ہیں، تُنک کر بولیں، اللہ نہ کرے، میری چاند سی بنّو ایسی ہو (ان کی بنّو کے چہرے کو اگر واقعی چاند سے تشبیہ دی جاسکتی تھی، تو یہ وہ چاند تھا، جس میں بُڑھیا بیٹھی چرخا کاتتی نظر آتی ہے۔) مختصر یہ کہ ہر شخص شاکی، ہر شخص خفا۔ اکبرِ اعظم کے نَورتن تو نَورتن،خواجہ سرا تک ہمارے خُون کے پیاسے ہو رہے تھے۔

پیَدا ہونا پیَسہ کمانے کی صُورت کا

ہم سے جم خانہ چھوٹ گیا۔اوروں سے کیا گلا، صبغے تک کھِنچے کھِنچے رہنے لگے۔ہم نے بھی سوچا، چلو تم روٹھے، ہم چھوٹے۔ واحسرتا کہ ان کی خفگی اور ہماری فراغت چند روزہ ثابت ہوئی۔ کیوں کہ دس پندرہ دن بعد اُنھوں نے اپنے فلیٹ واقع چھٹی منزل پر ''صبغے ایڈورٹائزرز (پاکستان) پرائیویٹ لمٹیڈ'' کا شوخ سا سائن بورڈ

---

* انار کلی کی والدہ: یہ خود بھی ایک زمانے میں یہُودی کی لڑکی کا کردار ادا کر چکی ہیں۔ یادِ ایّام !اِسی رول میں مرزا کی طبیعت اُن پر آئی تھی۔ اب بھی بے شمار ''ما بعد الطّبیعت'' تصویریں موصُوف کے البم میں اُن دنوں کی یاد تازہ کرتی ہیں، جب مرزا فلسفہ میں ایم۔اے۔ کرنے کے بعد فلسفہ کی حدّت کو حماقتوں سے مُعتدل کر رہے تھے۔

لگا دیا، جسے اگر بیچ سڑک پر لیٹ کر دیکھا جاتا تو صاف نظرآتا۔ دوسرا نیک کام اُنھوں نے یہ کیا کہ ہمیں ایک نئے صابُن ''اسکنڈل سوپ'' کے اشتہار کے لئے تصویر کھینچنے پر کمیشن (مامُور)کیا۔ عجب اِتّفاق ہے کہ ہم خود کچھ عرصے سے بڑی شِدّت سے محسوس کر رہے تھے کہ ہمارے ہاں عورت،عبادت اور شراب کو اب تک کلوروفارم کی جگہ استعمال کیا جاتا ہے۔یعنی درد و اذیّت کا احساس مٹانے کے لئے، نہ کہ سرور وانبساط کی خاطر۔ اسی احساس کو سُنّ کر دینے والی پینک کی تلاش میں تھکے ہارے فنونِ لطیفہ تک پہنچتے ہیں۔ اور یہ ظاہر سی بات ہے کہ ایسی عیاشی کو ذریعہء معاش نہیں بنایا جا سکتا۔ چنانچہ پہلی ہی بولی پر ہم نے اپنی متاعِ ہُنر سے پیچھا چُھڑانے کا فیصلہ کرلیا۔ پھرمُعاوضہ بھی معقول تھا۔ یعنی ڈھائی ہزار روپے۔ جس میں سے تین روپیے نقد اُنھوں نے ہمیں اسی وقت ادا کر دیئے۔ اور اسی رقم سے ہم نے گیورٹ کی 27 ڈگری کی سُست رفتار فلم خریدی، جو جِلد کے نِکھار اور نرمی کو اپنے اندر دھیرے دھیرے سمو لیتی ہے۔''چہرہ'' مہیّا کرنے کی ذمّہ داری اسکنڈل سوپ بنانے والوں کے سر تھی۔ تصویر کی پہلی اور آخری شرط یہ تھی کہ ''سیکسی'' ہو۔اس مقصدِ جمیل کے لئے جس خاتون کی خدمات پیش کی گئیں، وہ بُرقعے میں نہایت بھلی معلُوم ہوتی تھیں۔ بُرقعہ اُترنے کے بعد کُھلا کہ

خُوب تھا پردہ، نہایت مصلحت کی بات تھی

سیکس اپیل تو ایک طرف رہی، اس دُکھیا کے تو منہ میں مکّھن بھی نہیں پگھل سکتا تھا۔ البتّہ دوسری 'ماڈل' کا باکفایت لباس اپنے مضمرات کو چُھپانے سے بوجُوہ قاصر تھا۔ ہم نے چند رنگین ''شاٹ'' تیکھے تیکھے زاویوں سے لئے اور تین چار دن بعد مرزا کو پروجیکٹر سے TRANSPARENCIES دکھائیں۔ کوڈک کے رنگ دہک رہے تھے۔ سرکش خطُوط پکار پکار کر اعلانِ جنس کر رہے تھے۔ ہم نے اس پہلُو پر توجُّہ دلائی تو ارشاد ہوا، یہ اعلانِ جنس ہے یا کپڑے کی صنعت کے خلاف اعلان جنگ؟

تیسری ''سِٹنگ''(نشست) سے دس منٹ پیشتر مرزا حسبِ وعدہ ہماری کمک پر آگئے۔سوچا تھا، کچھ نہیں تو دُسراتھ رہے گی۔ پھر مرزا کا تجربہ، بسبب ان طبع زاد غلطیوں کے، جو وہ کرتے رہے ہیں، ہم سے کہیں زیادہ وسیع وگوناگوں ہے۔ لیکن اُنھوں نے تو آتے ہی آفت مچادی۔ اصل میں وہ اپنے نئے ''رول''(ہمارے

فیؔ مُشیر) میں پھُولے نہیں سما رہے تھے۔اب سمجھ میں آیا کہ نیا نوکر دوڑکر ہرن کے سینگ کیوں اکھاڑتا ہے اوراگر ہرن بھی نیا ہو تو

اَسدُاللہ خاں قیامت ہے!

ویسے بھی میک اپ وغیرہ کے بارے میں وہ کُچھ تعصُّبات رکھتے ہیں، جنہیں اس وقت 'ماڈل' کے چہرے پر تھوپنا چاہتے تھے (مثلاً کالی عورتوں کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ اُنھیں سفید سُرمہ لگانا چاہیے۔ ادھیڑ مرد کے دانت بہت اُجلے نہیں ہونے چاہئیں، ورنہ لوگ سمجھیں گے کی مصنوعی ہیں۔ علیٰ ہذاالقیاس)۔ بولے، لپ اسٹک پر ویسلین لگواؤ۔ اس سے ہونٹ VOLUPTUOUS معلوم ہونے لگیں گے۔آج کل کے مرد اُبھرے اُبھرے گُردا سے ہونٹ پہ مرتے ہیں۔ اور ہاں یہ پھٹیچر عینک اُتار کے تصویر لو۔ ہم نے رفعِ شر کے لئے فوراً عینک اُتار دی۔ بولے، صاحب! اپنی نہیں اس کی۔ بعد ازاں ارشاد ہُوا، فوٹو کے لیے نئی اور چمکیلی ساری قطعی موزوں نہیں۔ خیر۔ مگر کم از کم سینڈل تو اُتروا دو۔ پُرانا پُرانا لگتا ہے۔ ہم نے کہا، تصویر چہرے کی لی جا رہی ہے، نہ کہ پیروں کی۔ بولے، اپنی ٹانگ نہ اَڑاؤ۔ جیسے اُستاد کہتا ہے وہی کرو۔ ہم نے بیگم کا شیمپین کے رنگ کا نیا سینڈل لاکر دیا۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ اسے پہن کر اس کے ''ایکسپریشن'' میں ایک خاص تمکنت آگئی۔ بولے، صاحب! یہ تو جوتا ہے۔ اگر کسی کے بنیان میں چھید ہو تو اِس کا اثر بھی چہرے کے ایکسپریشن پر پڑتا ہے۔ یہ نکتہ بیان کر کے وہ ہمارے چِہرے کی طرف دیکھنے لگے۔

آنکھیں میری باقی اُن کا

ایڑی سے چوٹی تک اصلاحِ حُسن کرنے کے بعد اُسے سامنے کھڑا کیا اور وہ پیاری پیاری نظروں سے کیمرے کو دیکھنے لگی تو مرزا پھر بِین بجانے لگے ''صاحب! یہ فرنٹ پوز، یہ دو کانوں بیچ ایک ناک والا پوز صِرف پاس پورٹ میں چلتا ہے۔ آپ نے یہ نہیں دیکھا کہ اس کی گردن لمبی ہے اور ناک کا کَٹ یونانی۔ چہرہ صاف کہے دیتا ہے کہ میں صرف پروفائل کے لئے بنایا گیا ہوں۔'' ہم نے کہا ''اچھا، بابا! پروفائل ہی سہی۔''

اِس تکنیکی سمجھوتے کے بعد ہم نے تُرت پھُرت کیمرے میں ''کلوز اپ لینس'' فِٹ کیا۔ سُرمئی پردے کو دو قدم پیچھے کِھسکایا۔ سامنے ایک سبز کانٹے دار ''کیکٹس'' رکّھا اور اس پر پانچ سو واٹ کی اسپاٹ لائٹ ڈالی۔ اس کی اوٹ میں گُلِ رُخسار۔ ہلکا سا آؤٹ آف فوکس تاکہ خطُوط اور ملائم ہوجائیں۔ وہ دسویں دفعہ تن کر کھڑی ہوئی۔ سینہ بفلک کشیدہ، نچلا ہونٹ صوفیہ لارین کی طرح آگے کو نکالے۔ آنکھوں میں ''ادھر دیکھو، مِری آنکھوں میں کیا ہے'' والی کیفیت لیے۔ اور میٹھی میٹھی رَوشنی میں بل کھاتے ہوئے خطوط پھر گیت گانے لگے۔ رنگ پھر کُوکنے لگے۔ آخری بار، ہم نے دیدبان سے، اور مرزا نے کپڑوں سے پار ہوتی ہوئی نظر سے دیکھا۔ مُسکراتی ہوئی تصویر لینے کی غرض سے ہم نے ماڈل کو آخری پیشہ وارانہ ہدایت دی کہ جب ہم بٹن دبانے لگیں تو تم ہولے ہولے کہتی رہنا:

چِیز، چِیز، چِیز، چِیز، چِیز۔

یہ سُننا تھا کہ مرزا نے ہمارا ہاتھ پکڑلیا اور اِسی طرح برآمدے میں لے گئے۔ بولے، کتنے فاقوں میں سیکھی ہے یہ ٹِرک؟ کیا ریڑ ماری ہے، مُسکراہٹ کی! صاحب! ہر چہرہ ہنسنے کے لئے نہیں بنایا گیا! خصوصاً مشرقی چہرہ۔ کم از کم یہ چہرہ! ہم نے کہا، جناب! عورت کے چہرے پر مشرق مغرب بتانے والا قُطُب نُما تھوڑا ہی لگا ہوتا ہے۔ یہ تو لڑکی ہے۔ بُدھ تک کے ہونٹ مُسکراہٹ سے خم ہیں۔ لنکا میں ناریل اور پام کے درختوں سے گھِری ہوئی ایک نیلی جھیل ہے، جس کے بارے میں یہ روایت چلی آتی ہے کہ اس کے پانی میں ایک دفعہ گوتم بُدھ اپنا چہرہ دیکھ کر یونہی مُسکرا دیا تھا۔ اب ٹھیک اسی جگہ ایک خوبصورت مندر ہے جو اُس مُسکراہٹ کی یاد میں بنایا گیا ہے۔ مرزا نے وہیں بات پکڑ لی۔ بولے، صاحب! گوتم بُدھ کی مُسکراہٹ اور ہے، مونالِزا کی اور! بُدھ اپنے آپ پر مُسکرایا تھا۔ مونالِزا دوسروں پر مُسکراتی ہے۔ شاید اپنے شوہر کی سادہ لوحی پر! بُدھ کی مورتیاں دیکھو۔ مُسکراتے ہوئے اس کی آنکھیں جھُکی ہوئی ہیں۔ مونالِزا کی کُھلی ہوئی۔ مونالِزا ہونٹوں سے مُسکراتی ہے۔ اس کا چہرہ نہیں ہنستا۔ اس کی آنکھیں نہیں ہنس سکتیں۔ اِس کے بر عکس اجنتا کی عورت کو دیکھو۔ اُس کے لب بند ہیں۔ مگر خطُوط کھُل کھیلتے ہیں۔ وہ اپنے سموچے بدن سے مُسکرانا جانتی ہے۔ ہونٹوں کی کلی ذرا نہیں کِھلتی، پھر بھی اس کا ہرا بھرا بدن، اس کا انگ انگ مُسکرا اٹھتا ہے۔ ہم نے کہا، مرزا! اس میں اجنتا ایلورا کا

اِجارہ نہیں۔ بدن تو مارلِن مُنرو کا بھی کھلکھِلاتا تھا! بولے کون مسخرا کہتا ہے؟ وہ غریب عُمر بھر ہنسی اور ہنسنا نہ آیا۔ صاحب! ہنسنا نہ آیا، اس لئے کہ وہ جنم جنم کی نِندا سی تھی۔ اس کا رُواں رُواں بِلا وے دیتا رہا۔ اس کا سارا وجود، ایک ایک پور، ایک ایک مسام

انتظارِ صید میں اک دیدۂ بے خواب تھا

وہ اپنے چھتنار بدن، اپنے سارے بدن سے آنکھ مارتی تھی۔ مگر ہنسی؟ اس کی ہنسی ایک لذّت بھری سِسکی سے کبھی آگے نہ بڑھ سکی۔ اچھا۔آؤ۔ اب میں تمہیں بتاؤں کہ ہنسنے والیاں کیسے ہنسا کرتی ہی:

جات ہتی اِک نار اکیلی، سو بیچ بجار بھیو مجرائے
آپ ہنسی، کچھُو نَین ہنسے، کچھُو نَینَن بیچ ہنسو کجرائے
ہار کے بیچ ہمیل ہنسی، باجو بندن بیچ ہنسو گجرائے
بھویں مرور کے ایسی ہنسی جیسے چندر کو داب چلو بدرائے

مرزا برج بھاشا کی اِس چوپائی کا انگریزی میں ترجمہ کرنے لگے اور ہم کان لٹکائے سنتے رہے۔ لیکن ابھی وہ تیسرے مصرعہ کا خُون نہیں کر پائے تھے کہ صبغے کے صبر وضبط کا پیَمانہ چھلک گیا۔ کیونکہ 'ماڈل' سو روپے فی گھنٹہ کے حساب سے آئی تھی اور ڈیڑھ سو روپے گُزر جانے کے با وجود ابھی پہلی کِلک کی نوبت نہیں آئی تھی۔

تصویریں کیسی آئیں؟ تین کم ڈھائی ہزار روپے وصُول ہوئے یا نہیں؟ اشتہار کہاں چھپا؟ لڑکی کا فون نمبر کیا ہے؟ اسکنڈل سوپ فیکٹری کب نیلام ہوئی؟ ان تمام سوالات کا جواب، ہم انشا اللہ، بہت جلد بذریعہء مضمُون دیں گے۔ سِردست قارئین کو یہ معلُوم کر کے مَسرّت ہوگی کہ مرزا کے جس پالے پوسے کیکٹس کو ہم نے رُخِ رَوشن کے آگے رکّھا تھا، اُسے فروری میں پھُولوں کی نمائش میں پہلا انعام ملا۔

(جولائی۔۱۹۶۴ء)